نکیر کا اصول اور فرقہ واریت کا علاج، تحقیقی مطالعہ

حبیب الرحمٰن *

ABSTRACT:

فقہی مسائل کا بڑا حصہ متفق علیہ ہے لیکن بالعموم اختلافی مسائل پر بہت زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے جس سے یہ مسائل معرکہ آرائی کا سبب بن جاتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ دین اختلافات کی جولان گاہ نظر آتا ہے۔مزید یہ کہ وہ اجتہادی اور فروعی مسائل جن میں ائمہ کا اختلاف ہے ان میں ایک دوسرے کو برسرغلط ثابت کرنے کے رویہ نے امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اس سے طرح طرح کے شبہات جنم لیتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر حضرات کے سامنے شریعت کا یہ اصول ہی نہیں ہوتا کہ کن کن امور کو منکر قرار دے کر ان پر روک ٹوک کی جاسکتی ہے اور کس قسم کے مسائل میں دوسرے مسلک (فقہی مکتبِ فکر) کے پیروکاروں کو منع کرنا جائز نہیں ہے۔

زیرِنظر مقالہ میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ وہ اجتہادی یا فروعی مسائل جن میں فقہاء کا اختلاف ہے ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تحت کسی پر نکیر کرنے کا کوئی جواز ہے یا نہیں، کیونکہ غیر منکر پر نکیر اور روک ٹوک بجائے خود منکر ہے جبکہ آج کل بعض اہل علم بھی بے خبری یا غفلت کی وجہ سے اس نوع کے مسائل کو جنگ و جدل اور انتشار کا ذریعہ بنا کر فرقہ وارانہ فضا پیدا کر رہے ہیں اور اس قسم کے مسائل پر مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جا رہے ہیں گویا کہ کفر و اسلام کا مدار ہی ان مسائل پر ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر ہے۔[۱] ملا علی قاریؒ شارح مشکوۃ ''معروف اور منکر'' کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "**المعروف اسم جامع لکل ما عرف من طاعات اللّٰہ تعالیٰ، والتقرب الیہ، والاحسان الی الناس. والمنکر ضد ذالک جمیعہ**۔"[۲] (یعنی معروف کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت، قرب الٰہی اور لوگوں سے احسان جیسے جملہ امور آجاتے ہیں، جبکہ منکر اس کی ضد ہے)۔معروف کا لغوی

* ڈاکٹر، اسسٹنٹ پروفیسر، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد　برقی پتا: habib-rehman@iiu.edu.pk
تاریخ موصولہ: ۲۰۱۴/۵/۵ء

معنی جانی پہچانی چیز، وہ چیز جس کا چلن اور رواج ہو، جسے عقل مانتی ہو اور جو عدل پر پورا اترتی ہو۔ امور خیر جانے پہچانے ہیں مزید یہ کہ وہ فطرت سلیم اور عقل سلیم کے مطابق ہونے کی وجہ سے عدل کے تقاضوں پر بھی پورا اترتے ہیں اور معاشرہ میں بھی ان کا چلن ہو جاتا ہے، پھر شریعت نے بھی ان کی بجا آوری کا حکم دے دیا۔ (۳) منکر کا معنی بری اور ناگوار بات، اجنبی چیز، انکار، رد، اعتراض، عبرت ناک سزا، اجنبی چیز۔ منکر کے مفہوم میں وہ تمام امور شر آجاتے ہیں جو فطرت سلیم کے لیے اجنبی، قابل اعتراض، دشوار، ناگوار اور مبنی بر ظلم ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول ہیں اور سب سے اہم یہ کہ شارع نے ان کاموں سے روک دیا ہے (۴)۔ قرآن مجید میں معروف اور منکر کے الفاظ دس مقامات پر ایک ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔ (۵)

معروف میں وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں داخل ہیں جن کا شارع نے حکم دیا ہے اور ہر نبی نے ہر زمانے میں اس کی ترویج کی کوشش کی جبکہ منکر کے ضمن میں وہ تمام برائیاں آجاتی ہیں جن سے شارع نے منع کیا ہے۔ یہ ایک دینی فریضہ ہے۔ وہ آیات یا احادیث جن میں معروف کی ترویج اور منکر سے روکنے کا حکم ہے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ امت کے ہر فرد پر لازم ہے، البتہ تمام احکام شرعیہ کی طرح یہاں بھی اصول یہی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کا مدار استطاعت اور قدرت پر ہے۔ اس اصول کی صراحت رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے ہو جاتی ہے: **من رآی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ ..... الخ** (۶) (تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے مٹائے اگر وہ اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی روکنے کی استطاعت نہ ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے)۔ چونکہ ہر کام کی قدرت واستطاعت جدا ہوتی ہے اس لیے معروف کا حکم اور منکر سے روکنے کی قدرت اس امر پر موقوف ہے کہ یہ فریضہ سرانجام دینے والے کو معروف ومنکر کی تمیز ہو، اصول وفروع کا علم ہو، فرائض، سنن اور مستحبات میں فرق کر سکتا ہو، ائمہ وفقہاء کے اختلاف کی حقیقت سے آگاہ ہو۔ اگر ان ضروری امور سے آگاہی نہیں ہے تو پھر اس خدمت کے لیے کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔ ورنہ اصلاح کی بجائے فساد، جنگ وجدل اور فرقہ واریت کی فضا پیدا ہوگی۔ اس طرح دین کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچائے گا۔

موضوعِ بحث بھی یہی ہے کہ نکیر یعنی روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل تک محدود ہوگا جو امت میں مشہور یا متفق علیہ ہیں لیکن وہ مسائل جن میں اجتہادی اختلاف ہے ان میں روک ٹوک، مذمت اور نکیر نہیں کی جاسکتی۔ یہ افسوس ناک امر ہے کہ اس بنیادی اصول سے غفلت برتنے کی وجہ سے فروعی اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر امت مسلمہ کی وحدت کو غیر معمولی نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اگر مذکورہ اصول کو پیش نظر رکھ کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو سرانجام دیا جائے تو یہ ملی وحدت کو مزید تقویت دینے کا باعث بنے گا، کیونکہ اس آیت **والتکن منکم امۃ** (۷) ..... سے قبل دوسری آیت، **واعتصموا بحبل اللہ** (۸) ..... ہے جس میں اس جماعت کے قیام کے لیے دو بنیادی اوصاف، ایمان باللہ اور اخوت اسلامی کا ذکر ہے۔ ان دو خصوصیات کے بغیر اس عظیم فریضہ سے عہدہ برا ہونا نہ صرف دشوار ہے بلکہ

دین کی خدمت کے بجائے فساد کا اندیشہ ہے۔

معروف ومنکر کی درست پہچان

بسا اوقات شر اور فساد اس قدر پھیل جاتا ہے کہ معاشرے کی اجتماعی قدریں بدل جاتی ہیں جس سے خیر وشر کے تصورات دھندلا جاتے ہیں اور ان میں خلل پڑ جاتا ہے، اس لیے خیر وشر اور معروف ومنکر کے لیے ایک مستحکم تصور اور آفاقی معیار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس طرح فضائل اعمال اور رذائل صفات کا یہ تصور اصلاح معاشرہ سے مربوط ایک دائمی اسکیم پر مبنی ہے۔ اس لیے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ معروف ومنکر کا علم حاصل کرے، پھر اس کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے کیونکہ ان کی تعریف یہی کہ گئی ہے:

"**الامر بالمعروف و هو كل ما أمر به شرعاً، والنهي عن المنكر وهو كل ما ينهى عنه شرعاً**"،(۹) یعنی ہر وہ بات جس کا شریعت نے حکم دیا ہے وہ "معروف" ہے اور جس سے روکا ہے وہ منکر ہے۔ لیکن یہ بات اتنی سادہ بھی نہیں جتنی بالعموم سمجھی جاتی ہے، کیونکہ شریعت میں تمام احکام، اقدار اور اعمال کا ایک ہی مقام ومرتبہ نہیں ہے بلکہ ان میں کچھ اصول ہیں اور کچھ فروع، کچھ اعلیٰ ہیں اور کچھ ادنیٰ، کچھ ارکان ہیں اور کچھ ان کے توابع۔ بعض امور راجح ہیں اور بعض مرجوح اور کچھ اولیٰ ہیں اور کچھ غیر اولیٰ۔ اس لیے ضروری ہے کہ شریعت کی نگاہ میں جو مقدم ہے اسے مقدم رکھا جائے۔ کم اہم کو زیادہ اہم پر، فروع کو اصول پر، مختلف فیہ کو متفق علیہ پر ترجیح نہ دی جائے۔ اس طرح صغیرہ کو کبیرہ کا اور کبیرہ کو صغیرہ کا درجہ نہ دیا جائے۔ یہی وہ مومنانہ فراست ہے جس سے یہ فریضہ احسن انداز سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ معروف محقق ملا علی قاری اس حدیث "**من رای منکم منکرا ....**" کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ یہ فرض کفایہ ہے اور یہ خدمت وہی لوگ بجالا سکتے ہیں جو معروف ومنکر اور متفق علیہ ومختلف فیہ کی پہچان رکھتے ہوں:

انه لا يباشر الا من يعرف مراتب الاحسان وتفاوت المنكرات، و يميز بين المتفق عليه و المختلف فيه منها. (۱۰) (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو معروف اور منکر کے مراتب سے واقف ہوں اور جو متفق علیہ اور مختلف فیہ کی پہچان رکھتے ہوں۔)

یہی بات معروف فقیہ ابن مفلح مقدسی حنبلی نے "**الامر بالمعروف والنهي عن المنكر**" اور "**مراتب انكار المنكر**" کے تحت (۱۱) لکھی ہے۔ البتہ امام نووی نے اس نقطہ نظر کی زیادہ صراحت کی ہے، فرماتے ہیں: "**ثم انه انما يامر و ينهى من كان عالماً بما يامر به و ينهى عنه**"،(۱۲) (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ وہ شخص انجام دے جو شخص اس چیز کا علم بھی رکھتا ہو جس کا وہ حکم دے رہا ہے اور جس سے منع کرتا ہے)۔ وہ فرائض، واجبات یا حرام اشیاء جو مشہور ومعروف ہیں اور جن میں کسی نوع کا اختلاف نہیں ہے ان سے عام مسلمان آگاہ ہیں اور ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس دینی فریضہ کو ادا کرے، تاہم جن دقیق مسائل کا تعلق اجتہاد سے ہے ان کے بارے میں ایک سنہری اصول ذکر

کرتے ہیں: "فان كان من الواجبات الظاهرة و المحرمات المشهورة كا لصلوة و الصيام و الزنا و الخمر و نحوها فكل المسلمين علماء بها'' وان كان من دقائق الأفعال و الأقوال و مما يتعلق بالاجتهاد لم يكن للعوام مدخل فيه و لالهم انكاره بل ذالك للعلماء''[۱۳] (اگر ایک چیز واضح طور پر فرائض میں سے ہو مثلاً نماز، روزہ یا واضح طور پر حرام اشیاء میں سے ہو مثلاً زنا، شراب وغیرہ تو ہر مسلمان ان چیزوں کا علم رکھتا ہے لیکن اگر اس کا تعلق دقیق اجتہادی مسائل سے ہو تو ان میں نہ عامۃ الناس کا عمل دخل ہے اور نہ ہی وہ ان میں روک ٹوک کر سکتے ہیں بلکہ یہ صرف علما کا کام ہے۔) یہاں قاعدہ یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ دقیق اجتہادی مسائل میں نہ تو عامۃ الناس کا عمل دخل ہے اور نہ ہی ان میں روک ٹوک کی جا سکتی ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے ان تین اوصاف کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں:

"العلم قبل الامر والنهى، والرفق معه، والصبر بعده''. [۱۴] (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے پہلے علم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں نرمی اور اس کے بعد صبر ضروری ہے۔ یہاں علما کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مقدم قرار دیا ہے۔

معروف و منکر کے مراتب سے آگاہی

معروف و منکر کی پہچان کی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے مراتب سے بھی آگاہی ہو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب فرض یا واجب ہوتا ہے، کب مستحب ہوتا ہے، کب مباح اور کب حرام ہے۔ اصول یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی بجا آوری کے لیے امر بالمعروف واجب ہے، مستحب امور میں مستحب ہے، مباح امور میں مباح ہے۔ اس طرح حرام اشیاء سے باز رکھنے کے لیے نہی عن المنکر میں بھی حسب مراتب حکم ہے۔ مثلاً قطعی طور پر حرام کے ارتکاب سے روک ٹوک واجب ہے جبکہ مکروہ اشیاء سے روک ٹوک مستحب کے درجہ میں ہے۔[۱۵]

نہی عن المنکر کے ضمن میں متعدد شرائط ذکر کی جاتی ہیں، کیونکہ مختلف ادوار میں ایسے گروہ رہے ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملہ میں افراط و تفریط اور غلو کا شکار ہوئے اور اصلاح کی بجائے فساد کا ذریعہ بنے ہیں، مثلاً مرجئہ کا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ اس سے فتنہ و فساد پیدا ہوتا ہے اس لیے اب یہ فریضہ ساقط ہو چکا ہے۔ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ گروہ اور اس طرح کی رائے رکھنے والے حضرات بھی اعتدال کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ لیکن بعض دوسرے گروہ مثلاً خوارج، معتزلہ اور اہل تشیع کے ہاں یہ انتہا پسندانہ سوچ رہی ہے کہ ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنا اور ان سے قتال بھی ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا تقاضا ہے: فاهل البدع من الخوارج و المعتزلة و الشيعة و غيرهم يرون قتالهم و الخروج عليهم اذا فعلوا ما هو ظلم أو ما ظنوه هم ظلما و يرون ذالك من باب الامر بالمعروف و النهى عن المنكر و آخرون من المرجئة قد يرون ترك

الامر بالمعروف و النهی عن المنکر سقط فی هذا الزمان ظنا ان ذالک من باب ترک الفتنة[۱۶] (خوارج، معتزلہ اور اہل تشیع جیسے اہل بدعت یہ سمجھتے ہیں کہ حکمرانوں کے ساتھ جنگ کرنا اور ان کے خلاف خروج جائز ہے اگر وہ ظلم کریں یا جس کو وہ ظلم سمجھتے ہوں، وہ اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تقاضا سمجھتے ہیں جبکہ دوسرا گروہ **مرجئہ** کا یہ سمجھتا ہے کہ اس زمانے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ساقط ہو گیا ہے کیونکہ اس سے فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہے۔) یہ دونوں گروہ راہ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں، کیونکہ ایسی متعدد آیات اور احادیث ہیں جن میں امر بالمعروف کے ترک کی صورت میں نہ صرف انفرادی عذاب کی وعید ہے بلکہ اجتماعی عذاب کی بھی شدید وعید ہے، لیکن محض موہوم خدشات کی وجہ سے یہ فریضہ ساقط بھی نہیں ہو جاتا، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ تاہم اس کے مثبت نتائج کے حصول کے لیے علماء دین نے کچھ شرائط ضرور ذکر کی ہیں تاکہ امر بالمعروف کا یہ عمل اصلاح کی بجائے انتشار وفساد کا باعث نہ بنے۔ مثلاً ایک شرط یہ ہے کہ منکر کا علم ہو۔ یعنی یہ واضح طور پر معلوم ہو کہ جس بات سے منع کیا جا رہا ہے اس کی ممانعت قرآن وسنت سے صراحتاً ثابت ہے اور اس کی تعبیر وتشریح میں فقہاء کے ہاں کوئی اجتہادی اختلاف نہیں: **اذا اردت ان تامر انسانا بالمعروف أو تنهاه عن منکر .....ان تکون علی علم واضح فی المسئلة التی تتکلم علیها و لا یتاتی ذالک الا و معک نص من القرآن أو حدیث من السنة۔** [۱۷] (جب آپ کسی کو نیکی کا حکم دینے کا ارادہ رکھتے ہوں یا اسے کسی برائی سے منع کرنا چاہتے ہوں۔۔۔۔تو ضروری ہے کہ آپ کو اس مسئلے کا واضح علم ہو جس کے بارے میں آپ بات کر رہے ہوں اور یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کے پاس قرآن یا حدیث کا کوئی واضح حکم ہو۔) اسی طرح منکر کے مراتب سے آگاہی[۱۸] حکمت اور عمدہ سلیقہ سے اس فریضہ کو انجام دینا۔ مخاطب کے حالات سے واقف ہونا، خیر خواہی اور حسن نیت جیسے اوصاف سے متصف ہونا اور اس بات کا شعور کہ اس عمل کے نتیجے میں فائدہ کے بجائے نقصان نہیں ہوگا وغیرہ۔ [۱۹] اس نوع کی متعدد شرائط ذکر کی گئی ہیں۔ تاہم زیر نظر مقالہ کا موضوع وہ اصول ہے جسے بعض فقہاء نے "**من مسائل الاجتهاد التی لا تنکر**" کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔ [۲۰]

وہ مسائل جو قطعی اور متفق علیہ نہیں ہیں اور ان میں فقہاء ومجتہدین کی مختلف آراء ہیں ان کی بیشتر جزئیات کا تعلق تو صرف اولیٰ اور غیر اولیٰ سے ہے تاہم بعض اجتہادی مسائل ایسے بھی ہیں جن کے جائز و ناجائز یا حلال اور حرام ہونے میں بھی ائمہ مجتہدین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس نوع کے اجتہادی مسائل میں فقہاء کے ہاں تعبیر کا اسلوب حد درجہ احتیاط پر مبنی ہے۔ امام مالک سے منقول درج ذیل عبارت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کی نسبت کرتے وقت اسلاف کس درجہ محتاط تھے:

و لا ادرکت أحداً أقتدی به یقول فی شیء: هذا حلال و هذا حرام، وما کانو یجترؤن علی ذالک، و انما کانو یقولون: نکره کذا، و نری هذا حسنا، فینبغی هذا .....ولا یقولون حلال و لا

حرام. [۲۱] (وہ لوگ جن کی اقتدا کی جاتی ہے ان میں سے کوئی شخص بھی میرے علم میں ایسا نہیں ہے جو یہ کہے کہ یہ چیز حلال ہے یا حرام ہے، اور نہ اس کی وہ جرأت کرتے تھے، وہ صرف یہ کہتے تھے کہ ہم اس کو ناپسند کرتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ پسندیدہ ہے، مناسب یوں ہے۔۔۔۔یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ چیز حلال ہے یا حرام۔)

یعنی متقدمین علماء اور فقہاء قطعی دلیل کے بغیر کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کی بجائے یہ تعبیر اختیار کرتے تھے کہ یہ کام ناپسندیدہ ہے، غیر مناسب ہے یا ہم اس کام کو بہتر سمجھتے ہیں، یہ مناسب ہے وغیرہ۔ابن قیم نے اس نوع کی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں۔[۲۲] اسلاف کے اس طرز عمل کی وجہ یہ ہے کہ اختلافی امور میں کسی بھی رائے کو راجح قرار دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ محقق میں دلائل کو ترجیح دینے کی صلاحیت موجود ہو۔ یہ کفر اور اسلام کا مسئلہ نہیں بلکہ اسلام کے ہمہ جہت، عالمگیر اور دائمی ہونے کا بیّن ثبوت ہے، کیونکہ حالات وضروریات اور پیش آمدہ مسائل کے مطابق اجتہاد ناگزیر ہے اور اجتہادی عمل سے اختلافی آرا کا پیدا ہونا ناگزیر فطری بات ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلے یہ معلوم ہو کہ اختلاف کی گنجائش کن مسائل میں ہے اور کن امور میں اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔اس لحاظ سے احکام تین طرح کے ہیں:

۱۔ وہ احکام جن کی صراحت قرآن وسنت ثابتہ میں ہے، اور ان کا معنی ومفہوم بھی قطعی ہے، اس سے مراد وہ احکام ہیں جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہیں۔اس نوع کے احکام میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔اسلام کا مدار اس قسم کے قطعی احکام پر ہے اور یہی اسلام وکفر کی حدود کا تعین کرتے ہیں۔

۲۔ ایسی نصوص جو ظنی الدلالۃ ہیں، اس نوع کے احکام کی تعبیر وتشریح میں مجتہدین کی ایک سے زائد آراء ممکن ہیں کیونکہ ان کا معنی قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے، اسی لیے یہاں تعبیر کا اختلاف ہوسکتا ہے۔اسی طرح وہ احکام جو دلالت کے لحاظ سے تو قطعی ہیں، یعنی ان کے مفہوم میں تعبیر کا اختلاف نہیں ہے لیکن ان کا ثبوت قطعی نہیں ہے، بلکہ ان کے ثبوت میں مختلف آراء ہیں۔اس نوع کے احکام میں بھی اختلاف کی گنجائش ہے۔

۳۔ وہ احکام جن کی قرآن وسنت میں صراحت نہیں بلکہ مجتہدین کی اجتہادی کاوشوں کا ثمر ہیں، اس قسم کے احکام میں اختلاف کی وسیع گنجائش ہے۔[۲۳]

ضروری نہیں کہ جہاں بھی کسی کسی مسئلے میں ایک سے زائد آراء ہوں، یا بظاہر تعارض نظر آتا ہو، وہاں حقیقی اختلاف بھی ہو۔بعض اوقات ایک ہی نقطہ نظر کو بیان کرنے میں انداز تعبیر الگ الگ ہوجاتا ہے جس سے ایک ظاہر بین شخص کو تعارض دکھائی دیتا ہے حالانکہ وہ اختلاف تعبیر یا اختلاف تنوع ہوتا ہے۔موضوعِ بحث وہ اجتہادی مسائل ہیں جن میں فقہاء کے ہاں حقیقی اختلاف موجود ہو۔

علامہ یوسف القرضاوی بھی اس اصول کی تائید کرتے ہیں کہ اختلافی اور اجتہادی امور میں کسی پر نکیر نہیں کی جاسکتی:

"**والاختلاف فيه دليل على انه أمر اجتهادي والأمور الاجتهادية لاينكر فيها عالم على**

آخر" [۲۴] (کسی مسئلے میں اختلاف اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے اور اجتہادی مسائل میں کوئی عالم دوسرے عالم کو روک نہیں سکتا۔)

معلوم ہوا کہ کسی فقیہ، امام یا مجتہد کی اجتہادی رائے کو غلط قرار دے کر اس فقیہ کے پیروکاروں کو منع کرنا اور اس رائے کو قابل مذمت سمجھنا درست نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بے خبری اور فکری و اخلاقی انحطاط نے اجتہادی مسائل کو کفر اور اسلام کا مدار بنا کر بے شمار ایسے فتنے پیدا کئے جنہوں نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر دیا۔ بقول علامہ شیخ رشید رضا مسلکی تعصب کے علم برداروں نے فروعی اختلاف کو رحمت نہ بننے دیا اور اسے فساد کا ذریعہ بنا دیا۔ وہ اس علماء کے اس طرز عمل پر نوح کناں ہیں:

"**ولكن المتعصبين للمذاهب أبوا ان يكون الاختلاف رحمة، و شدد كل منهم .....وقد وقع من الفتن بين المختلفين فى الاصول و فى الفروع ماسود صحف التاريخ**" [۲۵] (فقہی مذاہب میں تعصب کرنے والوں نے اختلاف کو رحمت نہیں بننے دیا اور تشدد کیا بلکہ اصول اور فروع میں اختلاف کے نتیجہ میں ایسے فتنے پیدا کیے جنہوں نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر دیا۔)

اس فکری انحطاط کے جو دور رس اثرات مرتب ہوئے ان کا اندازہ ان واقعات سے کیا جا سکتا ہے جنہیں موصوف نے بطور مثال پیش کیا ہے مثلاً امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے پر لڑائی، قعدہ کی حالت میں تشہد کی انگلی کو حرکت دینے پر انگلی کاٹنے کا واقعہ، یہ فتوی کہ حنفی عورت کا شافعی المسلک مرد سے نکاح جائز نہیں وغیرہ۔ [۲۶]

فقہاء نے یہ اصول ذکر کیا ہے کہ جس مسئلہ میں فقہاء کی اجتہادی آراء مختلف ہوں، ان میں سے کسی بھی رائے کو اختیار کیا جا سکتا ہے اور کسی کو ان پر عمل کرنے سے روکنا درست نہیں، کیونکہ روک ٹوک صرف منکر پر کی جا سکتی ہے اور اجتہادی امور میں کوئی شخص کسی کو ملامت کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

اس اصول کا تجزیہ کرتے وقت یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ ملامت یا روک ٹوک صرف منکر کے ارتکاب پر کی جا سکتی ہے۔ جب تک کسی معاملہ کو منکر قرار دینا ہی محل نظر ہو یا درست نہ ہو یا اصلاح کی بجائے فتنہ وفساد کا موجب بن رہا ہو تو اس صورت میں نہی عن المنکر کا فریضہ نہ صرف ساقط ہو جاتا ہے بلکہ حرام ہے جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

فان الأمر والنهى و ان كان متضمنا لتحصيل مصلحة و دفع مفسدة فينظر فى المعارض له: فان كان الذى يفوت من المصالح أو يحصل من المفاسد أكثر لم يكن مامورا به: بل يكون محرما اذا كان مفسدته أكثر من مصلحته [۲۷] (امر اور نہی سے مقصود اگر کسی مصلحت کا حصول ہو اور کسی بگاڑ کو رفع کرنا مقصود ہو تو اس بات کو مدنظر رکھا جائے گا کہ اگر اس سے بڑی مصلحت ضائع ہو رہی ہو یا اس کے نتیجے میں بڑا فساد پیدا ہو رہا ہو تو اس صورت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر درست نہیں ہے بلکہ حرام ہو جاتا ہے۔)

مختلف مسالک کے پیروکار اور دعوت دین کا کام کرانے والے حضرات اس سنہری اصول کو اختیار کرلیں تو فساد کی جڑ کٹ سکتی ہے، تاہم لیکن اس پر عمل تب ہی ممکن ہے جب اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ خدمت دین کا جذبہ ہو اور مسلکی شناخت مقصود نہ ہو۔

امام غزالیؒ نے یہ مسئلہ اس عنوان ''**الشرط الرابع: ان یکون کونه منکراً معلوماً بغیر اجتهاد**'' کے تحت ذکر کیا ہے۔فرماتے ہیں:

فکل ماهو فی محل الاجتهاد فلا حسبة فیه، فلیس للحنفی ان ینکر علی الشافعی اکله الضب، والضبع، و متروک التسمیة، ولاللشافعی ان ینکر علی الحنفی شربه النبیذ الذی لیس بمسکر'' (۲۸) (ہر وہ مسئلہ جو اجتہادی نوعیت کا ہو اس میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے، کسی حنفی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ شافعی مسلک کے پیروکار کو گوہ کا گوشت کھانے اور بوقت ذبحہ بسم اللہ نہ پڑھنے پر ملامت کرے۔اسی طرح کسی شافعی مسلک کے پیروکار کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی حنفی کو غیر نشہ آور نبیذ پینے سے منع کرے)

اس سے اس اصول پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ مسائل جو اجتہادی نوعیت کے ہیں، ان میں کسی کا مواخذہ نہیں کیا جاسکتا مثلاً کسی حنفی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ شافعی مسلک کے پیروکار کو گوہ کا گوشت کھانے اور بوقت ذبح بسم اللہ نہ پڑھنے پر ملامت کرے، اسی طرح کسی شافعی مسلک کے پیروکار کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی حنفی کو غیر نشہ آور نبیذ پینے اور ذوی الارحام کی میراث لینے سے منع کرے۔ اس نوع کے متعدد مسائل ہیں جن میں احناف اور شوافع کا نہ صرف اولیٰ اور غیر اولیٰ کا اختلاف ہے بلکہ جائز و ناجائز کا اختلاف بھی ہے مثلاً احناف کے نزدیک پڑوسی کو بھی شفعہ کا حق ہے اور اس حق شفعہ کے تحت جو گھر خریدا گیا ہو اس کا استعمال بھی جائز ہے لیکن شوافع کے نزدیک پڑوسی کو حق شفعہ حاصل نہیں اس لیے اس قانون کے تحت حاصل کردہ گھر کا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔ اس نوع کے جملہ مسائل میں حنفی شافعی المسلک کو اور شافعی مسلک کا پیروکار حنفی کو منکر کا مرتکب قرار دے کر ملامت نہیں کرسکتا۔اس اصول کا اس نظریہ سے گہرا تعلق ہے کہ ''**کل مجتهد مصیب**'' (ہر مجتہد حق پر ہے) تاہم امام غزالیؒ نے اجتہادی اور اعتقادی امور میں فرق کرنے کے لیے ایک ضابطہ ذکر کیا ہے کہ مسائل دو طرح کے ہیں: ایک وہ جن کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ: ''**کل مجتهد مصیب**'' یہ نقطہ نظر مطلق نہیں ہے بلکہ مخصوص احکام کے بارے میں ہے: ''**و هی احکام الافعال فی الحل والحرمة**'' یعنی یہ کسی فعل کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں ہے۔اگر کسی چیز کے حلال اور حرام میں اجتہادی نوعیت کا اختلاف ہے اور اس میں کسی ایک مجتہد سے غلطی بھی ہوئی ہے۔تو اس نوع کے مسائل میں کسی مجتہد کی خطا پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہوتی بلکہ یہاں دلائل ظنی ہوتے ہیں اس لیے ہر مجتہد کو حق پر تصور کیا جائے گا۔

دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق اس نقطہ نظر سے ہے کہ ''**ان یکون المصیب فیه الا واحداً**'' یعنی ان مسائل میں

حق پر صرف کوئی ایک ہی ہوتا ہے مثلاً رویت باری کا مسئلہ، قدر و جبر کی بحث اور اس نوع کے دیگر عقائد سے متعلق مسائل تو ان کا حکم اجتہادی مسائل جیسا نہیں بلکہ ان امور میں جو غلطی پر ہے اس کی غلطی بالکل واضح اور قطعی ہے: ''**خطاء هم معلوم على القطع، بخلاف الخطاء فى مظان الاجتهاد**[۲۹] (ان امور میں جو غلطی پر ہے اس کی غلطی بالکل واضح اور قطعی ہے۔ یہ اس نوع کی غلطی نہیں جو اجتہادی مسائل میں ہوتی ہے)۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مبتدعین کی بدعات پر تکفیر جائز ہے۔ علامہ شہرستانی کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عقائد میں اختلاف اجتہادی اور فروعی مسائل جیسا نہیں ہے، اس طرح اصول میں بھی کسی ایک مجتہد کو ''مصیب'' قرار دیا جاسکتا ہے۔:

ثم اختلف اهل الاصول فى تصويب المجتهدين فى الاصول والفروع فعامة اهل الاصول على ان الناظر فى المسائل الاصولية والاحكام العقلية اليقينية القطعية، يجب ان يكون متعين الاصابة فالمصيب فيها واحدا بعينه. [۳۰] (اصول اور فروع میں مجتہدین کو مصیب قرار دینے کے حوالے سے اہل اصول کا اختلاف ہے۔ عام علمائے اصول کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصولی مسائل اور قطعی اور یقینی احکام میں مصیب ایک ہی ہوگا۔)

لیکن جہاں تک فروعی مسائل کا تعلق ہے تو ان میں کسی دوسرے فقہی مسلک کے پیروکار کی تکفیر یا تضلیل نہیں کی جاسکتی، علامہ شہرستانی اس حوالے سے اپنے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"**بين الفريقين اختلافات كثيرة فى الفروع، ولهم فيها تصانيف، وعليها مناظرات، وقد بلغت النهاية فى مناهج الظنون، حتى كأنهم قد أشرقوا على القطع واليقين، وليس يلزم بذالك تكفير ولا تضليل، بل كل مجتهد مصيب**''[۳۱] (دونوں گروہوں میں فروعی مسائل میں بہت زیادہ اختلافات ہیں اور اس حوالے سے کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور مناظرے بھی کیے جاتے ہیں اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ ظنی چیزوں کو وہ قطعی و بدیہی سمجھتے ہیں حالانکہ اس قسم کے مسائل میں کسی کی تکفیر یا تذلیل نہیں کی جاسکتی بلکہ ہر مجتہد حق پر ہوتا ہے۔)

یعنی فروعی مسائل میں معرکۃ الاراء کتب اور مناظروں کا جو بازار گرم ہے اس سے لگتا ہے کہ ان اجتہادی مسائل میں ان فقہاء کے پاس قطعی اور بدیہی دلائل ہیں۔ جبکہ اس قسم کے مسائل میں کسی کی تکفیر یا تضلیل نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ یہ بڑے منکرات میں سے ہے جبکہ فروعی اور اجتہادی مسائل کی نوعیت ان سے حکم کے اعتبار سے مختلف ہے۔ امام نوویؒ نے اس نقطہ نظر کو زیادہ صراحت سے بیان کیا ہے: ''**انما ينكرون ما اجمع عليه اما المختلف فيه فلا انكار فيه** [۳۲] (روک ٹوک ان مسائل پر کی جاسکتی ہے جو متفق علیہ ہیں البتہ جو اختلافی مسائل ہیں ان میں کسی پر نکیر نہیں کی جاسکتی۔)

یہاں نکیر کا اصول بھی ذکر کردیا ہے کہ جو مسائل متفق علیہ ہے ان کی خلاف ورزی کو منکر قرار دے کر ممانعت کی جاسکتی ہے لیکن اجتہادی امور میں کسی پر نکیر درست نہیں ہے۔ اس کی دلیل وہی ہے جس کی طرف امام غزالیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے کہ "**كل مجتهد مصيب**'' اور اسے جمہور محققین کا نقطۂ نظر قرار دے کر ترجیح بھی دی ہے: "**وهذا هو المختار عن كثير**

من المحققين أو أكثرهم" (۳۳)

امام قرطبیؒ نے بھی فروعی مسائل میں مجتہدین کے اختلاف کے بارے میں جمہور کا نقطہ نظر یہ بتایا ہے کہ ان مسائل میں ہر مجتہد حق پر ہے:

وقد اختلف الناس فی المجتهدين فی الفروع اذا اختلفوا.....وقال جمهور اهل السنة وهو المحفوظ عن مالک وأصحابه: ان الحق فی مسائل الفروع فی الطرفين و كل مجتهد مصيب،،(۳۴) (مجتہدین کا جب فروعی مسائل میں اختلاف ہو تو اس معاملے میں علما کا اختلاف ہے کہ ہر ایک حق پر ہے یا کوئی ایک حق پر ہے۔ جمہور اہلسنت جن میں امام مالک اور ان کے رفقا بھی شامل ہیں وہ کہتے ہیں کہ فروعی مسائل میں دونوں فریق حق پر ہیں اور ہر مجتہد کا نقطہ نظر درست ہے۔)

امام قرطبی نے بطور تائید داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے اس فیصلے کو پیش کیا ہے جس کا ذکر سورہ انبیاء میں ہے، اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کے اس قول: **اذا اجتهد العالم فاخطاء** کو بھی بطور دلیل پیش کیا ہے۔ بعض متقدمین علماء کا نقطہ نظر نہ صرف فروع بلکہ اصول کے بارے میں بھی یہ ہے: "**كل مجتهد مصيب فی الاصول**،، اور ان کا استدلال سورہ النساء کی آیت ۱۱۵ میں "**بعد ماتبيّن**،، (۳۵) کے الفاظ سے ہے کہ وعید اس صورت میں ہے جب حق بالکل واضح ہو جائے اور پھر بھی اس کا انکار کیا جائے۔ البتہ امام رازی نے یہاں بھی توجیہ ان الفاظ میں کی ہے: "**بل بمعنى سقوط الاثم عن المخطی**،، (۳۶) (بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ غلطی کرنے والے سے گناہ ساقط ہو جائے گا۔) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے ان دونوں نقطۂ ہائے نظر کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے بہترین توجیہ کی ہے: "**اذا اراد بالخطاء الاثم فليس المجتهد بمخطئ بل كل مجتهد مصيب**،، (اگر اجتہادی غلطی سے یہ مراد لیا جائے کہ اس طرح کی غلطی پر مجتہد گناہ گار ہوگا تو اس مفہوم میں کوئی مجتہد غلطی پر نہیں ہے بلکہ ہر ایک حق پر ہے۔) جب ہر ایک حق پر ہے تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے مجتہد یا اس کے پیروکار پر نکیر کرے۔ علامہ عبدالرحمٰن القماش نے الحاوی فی تفسیر القرآن الکریم "**باب لا انكار فی مسائل الخلاف**،، کے تحت اس مسئلہ کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے:

الانكار من المنكر انما يكون فيما اجتمع عليه فاما المختلف فيه فلا انكار فيه، لان كل مجتهد مصيب او المصيب واحد ولا نعلمه، ولم يزل الخلاف بين السلف فی الفروع و لا ينكر أحد على غيره مجتهداً فيه، انما ينكرون ماخالف نصاً أو اجماعاً قطعياً أو قياسا جلياً. (۳۷) (وہ مسائل جو متفق علیہ ہیں ان میں روک ٹوک کی جا سکتی ہے لیکن جو اختلافی مسائل ہیں ان میں روک ٹوک نہیں کی جا سکتی کیونکہ ہر مجتہد حق پر ہے یا یہ کہ ان میں سے ایک حق پر ہے مگر ہم جانتے نہیں ہیں۔ فروع کے اندر اختلاف اسلاف میں بھی رہا ہے لیکن کسی ایک نے دوسرے مجتہد پر ملامت نہیں کی وہ صرف ان چیزوں میں روک ٹوک کرتے تھے جو کسی نص کے خلاف ہو یا

اجماعِ قطعی کے خلاف ہو یا واضح قیاس کے خلاف ہو۔) موصوف نے یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد اس اصول کو متفق علیہ قرار دیا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ اختلاف رائے رکھنے والے فقہاء کے بارے میں یہ حسن ظن ہونا چاہئے کہ انہوں نے بھی منشا الٰہی معلوم کرنے میں حسب استطاعت اجتہاد کیا ہے، کیونکہ اجتہاد انسانی کاوش ہے، جس میں اس اجتہادی رائے کے درست ہونے کا بھی امکان ہے اور غلط ہونے کا بھی امکان ہے۔ اس لیے کسی کی نیت پر شک کرنا، بدگمانی سے کام لینا یا یہ رائے قائم کر لینا کہ انہوں نے قصداً اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے، یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے اور یہ بات آداب اختلاف کے بھی منافی ہے۔ فقہاء سلف اس اصول سے بخوبی آگاہ تھے اور اس کا دوسروں کے سامنے کھلے بندوں اعتراف بھی کرتے تھے۔ جلیل القدر فقیہ امام سفیان ثوریؒ اپنا طرز عمل بیان کرتے ہیں:

ما اختلف فيه الفقهاء فلا أنهى أحداً من اخوانى ان ياخذ به. [۳۸] (جن جزئیات میں فقہاء کا اختلاف ہے، ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ کسی ایک رائے کو اختیار کرے، میں کسی کو اس سے نہیں روکتا۔) اس بات کی نصیحت دیگر فقہاء کو ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اذا رأيت الرجل يعمل العمل الذى قد اختلف فيه و انت ترى غيره فلا تنهه [۳۹] (جب آپ کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ کوئی ایسا عمل کر رہا ہو جس میں اختلاف ہوا اور آپ کا موقف اس کے خلاف ہو تو آپ اسے نہیں روک سکتے۔)

امام شافعیؒ کے اس قول میں جو اخلاص وللّٰہیت جھلکتی ہے، وہ اس بات کی نشانی دہی کرتی ہے کہ ان ائمہ مجتہدین کے مناظروں اور مناقشوں کا مقصد صرف حق کی تلاش تھا: **وما كلمت احداً قط الا و لم أبال بيّن الله الحق على لسانى أو لسانه۔**" [۴۰] (جب بھی میں نے کسی سے بات کی ہے تو مجھے اس بات کی کبھی پرواہ نہیں رہی کہ حق کا اظہار اللہ میری زبان سے کردے یا دوسرے فریق کی زبان سے کردے یعنی مباحثہ کا مقصد علمی بڑائی نہیں تھا بلکہ حق کا اظہار ہوتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین کے ہاں اس نوع کے اختلافی مسائل پر نہ صرف یہ کہ نکیر نہیں کی جاتی تھی بلکہ حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر تلامذہ متعدد مسائل میں اپنے استاد سے اختلاف کرتے ہیں مثلاً امام ابوحنیفہؒ اور ان کے دونوں تلامذہ استنباط مسائل میں بالعموم ابراہیم نخعی کے منہج کو اختیار کرتے تھے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام ابوحنیفہ ابراہیم نخعی کے مذہب پر کسی مسئلہ کی تخریج کرتے، لیکن امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا موقف امام صاحب سے اس مسئلہ میں مختلف ہوتا۔ تمام تر عقیدت، احترام اور جذباتی وابستگی کے باوجود مکمل فکری آزادی پائی جاتی تھی اور علمی تحقیق پر مبنی اختلاف کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔

مزید یہ کہ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر ان اختلافی فقہی مسائل پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو ان میں زیادہ تر وہ اختلافی

مسائل ہیں جن کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایک رائے یا مسلک کو دوسرے مسلک پر ترجیح دی گئی ہے۔ بالخصوص وہ فروعی مسائل جن میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف تھا اور ان سے دونوں طرح کی آراء منقول ہیں، مثلاً ایام تشریق، تکبیروں اور عیدین کی تکبیروں کا اختلاف، آمین آہستہ یا بلند آواز سے پڑھنے کا اختلاف، اقامت میں کلمات اذان کو ایک بار یا دو بار پڑھنے کا اختلاف وغیرہ، ان میں جواز یا عدم جواز کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اختلاف یہ ہے کہ زیادہ بہتر اور راولیٰ کیا ہے۔ اس لیے اس نوع کے مسائل میں قطعی موقف اختیار کرنے میں احتیاط کا اصول اپنایا گیا ہے۔ "**تجنب القطع فی مسائل الاجتھاد**" کے عنوان کے تحت ایک معاصر عالم لکھتے ہیں:

"**فالاجتهاد اذا كان وفقاً لاصول الاجتهاد و مناهج الاستنباط فی علم اصول الفقه يجب عدم الانكار عليه ولا ينكر مجتهد علی مجتهد آخر و لا ينكر مقلد علی مقلد آخر والا أدی ذالک الٰی فتنة**" [۴۱] (جب اجتہاد اجتہاد کے اصولوں کے موافق ہو اور اصول فقہ کے اسالیب استنباط کو مدنظر رکھا گیا ہو تو ایسی صورت میں روک ٹوک نہ کرنا واجب ہے۔ کوئی ایک مجتہد دوسرے مجتہد پر روک ٹوک نہیں کرسکتا اور نہ کوئی مقلد کسی دوسرے مقلد پر روک ٹوک کرسکتا ہے ورنہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا۔)

علامہ ماوردیؒ نے "الاحکام السلطانیۃ" میں اس مسئلہ میں فقہاء شافعیہ کا اختلاف نقل کیا ہے کہ وہ شخص جو محتسب کے منصب پر ہو اجتہادی امور میں نکیر کرسکتا ہے یا نہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ کرسکتا ہے، اس صورت میں یہ شرط عائد کی ہے: **يجب علی المحتسب ان يكونا عالماً من اهل الاجتهاد فی احكام الدين.** "(منع کرنے والے شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین کے مسائل کا عالم ہو اجتہاد کا اہل ہو) جبکہ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ محتسب کو ایسا کرنے کا حق نہیں اور اس موقف کی تائید کرنے والے فقہاء کے ہاں اسے اہل اجتہاد سے ہونا ضروری نہیں تاہم اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ان منکرات سے آگاہ ہو جو متفق علیہ ہیں: **اذا كان عارفاً بالمنكرات المتفق عليها.** [۴۲]

حاصل بحث

جب کسی چیز کے جائز ہونے یا نہ ہونے یا اولیٰ اور غیر اولیٰ ہونے کا تعین اجتہاد سے کیا جائے تو ضروری ہے کہ بعض دلائل سے اس کا جواز یا اولیٰ ہونا اور بعض دلائل سے عدم جواز یا غیر اولیٰ ہونا ثابت ہوتا ہو، یعنی اس مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر اس قسم کے دلائل ہوں کہ ایک مجتہد اسے جائز یا اولیٰ سمجھتا ہو اور دوسرا ناجائز یا غیر اولیٰ تصور کرتا ہو۔

اس صورتحال میں کسی مجتہد کے پاس قطعی یا یقینی دلیل نہیں ہوتی اسی لیے اپنی تحقیق کے بعد غالب گمان کی بنیاد پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی تحقیق درست ہے لیکن اس میں خطاء کا امکان بھی ہے۔ کسی مجتہد کے اجتہاد میں امکان خطاء کا اصول ایک دوسرے ضابطے کے لیے اساس فراہم کرتا ہے کہ اس نوع کے اجتہادی مسائل میں کسی فقیہ و مجتہد کے پیروکار کو برسرغلط ثابت کرنا اور اس کے مسلک کو منکر قرار دے کر روک ٹوک کرنا کسی لحاظ سے درست نہیں ہے، تاہم یہ ضابطہ عقائد کے باب

میں نہیں ہے اور نہ ہی ان فقہی مسائل میں ہے جو متفق علیہ اور اجماعی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اس کا دائرہ ان فروعی مسائل تک محدود ہے جن میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔

مراجع وحواشی

(۱) آل عمران۳:۱۰۴،۱۱۰،۱۱۴۔ الاعراف ۷:۱۵۷۔ التوبہ۹: ۶۷، ۷۱، ۱۱۲۔ الحج ۲۲:۴۱۔ لقمان ۳۱: ۱۷

(۲) ملاعلی قاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشكاة المصابيح، ۸:۸۶۰، المكتبة التجارية، مكة المكرمة

(۳) علامہ راغب اصفہانی مع تحقیق ندیم مرعیشلی، معجم مفردات الفاظ القرآن، ص۵۲۶، المكتبة المرتضوية لاحياء الاثار الجعفرية.　(۴) حوالہ بالا　(۵) حوالہ نمبر ۱ میں تفصیل موجود ہے

(۶) مسلم بن حجاج ۱:۶۹، (حدیث نمبر ۴۹) دارالحدیث القاہرہ، طباعت اوّل ۱۴۱۲ھ۔ ۱۹۹۱م

(۷) آل عمران ۳:۱۰۴　(۸) آل عمران ۳:۱۰۳

(۹) الآداب الشرعية والمنح المرعية، ابوعبدالله محمد بن مفلح المقدسي الحنبلي، ۱: ۲۱۵، مکتب نزار مصطفیٰ الباز، مکۃ المکرّمۃ، طباعت اوّل، ۱۴۱۷ھ، ۱۹۹۶م

(۱۰) مرقاۃ المفاتیح ۸:۸۶۰　(۱۱) الاداب الشرعیۃ ۱:۲۲۳

(۱۲) صحیح مسلم بشرح الامام النووی، ۱:۲۳، موسسۃ مناہل العرفان، بیروت　(۱۳) حوالہ بالا

(۱۴) شيخ الاسلام احمد بن تيميةؒ، مجموع فتاویٰ، ۲۸ :۱۳۷، الرياسة العامة لشوؤن الحرمين الشريفين

(۱۵) محمد بن ابی بکر المعروف ابن قیم جوزیہ، أعلام المؤقعین، ۱: ۳۱، دار الکتب بیروت، طباعت دوم، ۱۴۱۴ھ، ۱۹۹۳م

(۱۶) الآداب الشرعیۃ ۱: ۲۱۹، ۲۲۰　(۱۷) حوالہ بالا ۱:۲۱۴

(۱۸) شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ ۲۸: ۱۲۹　(۱۹) حوالہ بالا

(۲۰) مختلف فقہاء نے اس اصول کا عنوان اپنے اپنے الفاظ میں قائم کیا ہے مثلاً ابن مفلح مقدسی نے الآداب الشرعيه میں "على من و متى يجوز الانكار" کے تحت یہی اصول ذکر کیا ہے، امام نوویؒ نے اما المختلف فيه فلا انكار فيه کے الفاظ نقل کئے ہیں اور ملاعلی قاری نے ويميز بين المتفق عليه و المختلف فيه منها کی تعبیر اختیار کی ہے۔ دیکھئے: الآداب الشرعیہ ۱: ۲۱۵، صحیح مسلم بشرح الامام النووی ۱:۲۳، مرقاۃ ۸:۸۶۰

(۲۱) أعلام المؤقعین ۱:۳۲　(۲۲) حوالہ بالا

(۲۳) ڈاکٹر یوسف القرضاوی، في فقه الأولويات، ص۷۶، مكتبة وهبه، القاهره طباعت اوّل ۱۴۱۵ھ۔ ۱۹۹۵م

(۲۴) حوالہ بالا

(۲۵) یہ بات موصوف نے مغنی ابن قدامہ کے مقدمہ میں "كلمة في فوائد كتابي المغني والشرح الكبير" کے عنوان کے تحت تحقيق الحق في اختلاف الامة و سيرة الائمة کے ذیل میں لکھی ہے۔ دیکھئے مقدمہ المغنی مع الشرح الکبیر، محمد بن احمد قدامہ ۱:۲ دار الکتاب العربی ۱۴۰۳ھ۔ ۱۹۸۳م

(۲۶) حوالہ بالا ۱:۱۳　(۲۷) شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ ۲۸:۱۲۹

(۲۸) محمد بن احمد الغزالی، احیاء علوم الدین، ۲: ۵۱۷ دار الوعی حلب، دمشق طباعت اوّل، ۱۴۱۹ھ

(۲۹) حوالہ بالا۲:۵۱۹

(۳۰) محمد بن عبدالکریم الشہر ستانی ،الملل والنحل،ا: ۳۵۰۔۳۵۱، دارالسرور بیروت، لبنان ۱۹۲۸م

(۳۱) حوالہ بالاا: ۳۶۸ (۳۲) صحیح مسلم بشرح الامام نووی ا:۲۳ (۳۳) حوالہ بالا

(۳۴) ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی،الجامع لأحکام القرآن المعروف تفسیر القرطبی، ۱۱:۱۷۲دارالکتاب بیروت، طباعت سوم،۱۴۲۱ا۔۲۰۰۰م

(۳۵) امام محمد الرازی،التفسیر الکبیر مفاتیح الغیب،۴: ۲۲۰،داراحیاء التراث العربی،بیروت، طباعت سوم،۱۹۹۹م

(۳۶) حوالہ بالا (۳۷) عبدالرحمٰن القماش،الحاوی فی تفسیر القرآن الکریم

(۳۸) خطیب بغدادی، کتاب الفقیہ والمتفقه، ۲: ۶۹ المکتبة العلمیة

(۳۹) حوالہ بالا (۴۰) حوالہ بالا۲:۲۶

(۴۱) عمر بن عبداللہ کامل، آداب الحوار وقواعد الاختلاف،ص۴۳

(۴۲) علی بن محمد المعروف بالماوردی ،الاحکام السلطانیہ،دارالحدیث القاہرۃا:۳۵۰۔۳۵۱